AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

وجودیت:(Existentialism) ایک مطالعہ (بحوالہ خصوصی "آگ کا دریا" اور "کاروانِ وجود)"

Wujudiyat (Existentialism): A Study with Special Reference to "Aag ka Darya" and "Karwan-e-Wujood"

پروفیسر ڈاکٹر صائمہ ارم

چیئر پرسن، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور A

محمد کیومرثی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو زبان وادب، تہران یونیورسٹی، ایران

ڈاکٹر عظمت رباب

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

Prof. Dr. Saima Iram
Chairperson, Department of Urdu, Government College University, Lahore
Muhammad Kioumersi
Associate Professor, Department of Urdu Language & Literature, University of Tehran, Iran
Dr. Azmat Rabab
Associate Professor, Department of Urdu, Lahore College for Women University, Lahore

Abstract

This study explores the concept of Wujūdiyat (Existentialism) with special reference to the novels Aag ka Darya by Qurratulain Hyder and Karwan-e-Wujood. Existentialism, as a philosophical movement, foregrounds individual freedom, anxiety, alienation, identity crisis, and the search for meaning in a seemingly absurd world. This research investigates how these existential concerns are artistically represented within the socio-historical and cultural contexts of the selected texts.In Aag ka Darya, the continuity of history and the fragmentation of identity reflect the existential dilemma of man caught between tradition and modernity. The characters struggle with displacement, loss of belonging, and the quest for self-realization across different epochs. Similarly, Karwan-e-Wujood presents the inner turmoil of individuals confronting moral uncertainty, spiritual emptiness, and the burden of choice in a rapidly changing society.

By employing a qualitative and analytical methodology, this study examines thematic structures, characterization, and narrative techniques to highlight the existential dimensions embedded in these works. The research concludes that both novels not only embody existential philosophy in a localized South Asian context but also reinterpret it through indigenous cultural, historical, and metaphysical perspectives. Thus, Wujūdiyat in Urdu fiction emerges as a dynamic synthesis of Western existential thought and Eastern intellectual traditions.

Keywords: *Wujūdiya, Qurratulain Hyder, Karwan-e-Wujood, Aag ka Darya, self-realization, examines thematic.*

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ادب میں انسانی زندگی کو مختلف حوالوں سے دیکھا، پرکھا اور بیان کیا جاتا رہا ہے۔ اظہار کے مختلف طریقوں نے مختلف رجحانات، تحریکوں اور اصناف کو جنم دیا۔ کلاسیکی رویے کے تحت ایک معیار مقرر کیا گیا اور اس روایت کی پابندی کو ادیبوں کے لیے لازم قرار دے دیا گیا۔ ترقی پسند ادیب انسان کو تاریخی مادیت کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ انسان کو بامعنی بنانے کے لیے اس کا تعلق ماضی اور مستقبل سے جوڑنے کی کوشش کی گئی تاکہ انسان کو زیادہ وسیع تناظر میں دیکھا جا سکے۔ رومانویت پسند ماضی پسندی کا رجحان رکھتے ہیں۔ ان سب رجحانات اور تحریکوں کے ذریعے انسان کو کسی نہ کسی حوالے سے جوڑنے اور مربوط کرنے کی کوشش کی گئی۔ افراد کو سیاسی، سماجی، مادی اور اخلاقی و مذہبی پس منظر میں دیکھا اور بیان کیا گیا۔

اس طرزِ فکر میں تبدیلی کی بنیاد پہلی جنگِ عظیم بنی۔ صنعتی انقلاب سے معاشرتی ڈھانچہ شکست وریخت کا شکار ہو گیا تھا۔ زرعی معاشرے میں انسان ایک خاندان ایک کُل ایک مرکز کا حصہ تھا۔ وہ جب اپنا گاؤں، نسل اور قبیلہ چھوڑ کر شہر آبسا تو اسے احساسِ تنہائی نے آگھیرا۔ اُسے احساس ہوا کہ جنگ میں لاکھوں کروڑوں لوگ ایسے ہی مر گئے ہیں۔ اُن کی کوئی شناخت، مذہب اور حوالہ نہیں ہے تو بھلا انسانی زندگی کا کیا حوالہ ہو سکتا ہے۔ اس سوچ سے اخلاقی و مذہبی حوالوں اور فکر میں بھی تبدیلی آئی۔ اُس نے سوچا کہ انسان اس زمین پر تنہا ہے۔ روحانی، معاشرتی اور معاشی اقدار کوئی چیز نہیں۔ انسان ہر قسم کے رشتے ناتے سے الگ ہے۔ ان سارے حوالوں نے اس احساس کو جنم دیا کہ وہ تنہا ہے، نہ کوئی اس کے آگے ہے نہ پیچھے۔ فرد کو تنہائی، کرب، جدائی، محرومی، اپنی ذات کے معدوم ہونے کا احساس ہوا۔ اس نے خود اپنی ذات کو مرکز قرار دے لیا۔ یہ سب احساسات اس دور کے ادیبوں میں ان کی تخلیقات کے ذریعے اجاگر ہوئے۔ اسی سے وجودیت نے جنم لیا جس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ جو موقع پر موجود ہے وہی ہے اور ہم لمحۂ موجود ہی میں ہیں۔ اس دور کی تحریروں میں یہ کرب، تنہائی، محرومی اور شکست وریخت جھلکتا ہے۔

عموماً وجودیت کی دو قسمیں کی جاتی ہیں۔ دینی وجودیت اور لادینی وجودیت۔ ان دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ ایک گروہ خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور دوسرا انکار۔ پہلے گروہ کا پیشوا کرکیگارڈ ہے اور دوسرے کا ہائیڈگر۔ سارتر لادینی وجودیوں کا علمبردار ہے۔ ان دونوں گروہوں کے فلسفی اس بنیادی نظریے پر متفق ہیں کہ وجودیت ماہیت پر مقدم ہے (Existence Precedes Essence) وجود سے مراد محض فرد کا وجود ہے۔ انسانی وجود کی اہمیت کو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے لیکن وہ بات جو وجودیت کے نظریے میں ہے وہ ہمیں ماضی میں کہیں نظر نہیں آتی۔ ماضی میں تو انسان کو بحیثیت مجموعی اور گروہ یا جماعت سے منسلک کر کے دیکھا اور سمجھا گیا ہے جبکہ وجودی ہر انسان کے انفرادی وجود کو اہم ترین شے تصور کرتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق ہر فرد دوسرے سے مختلف ہے، وہ اپنے عمل میں آزاد ہے اور اپنے ہر عمل کا خود ہی ذمہ دار ہے۔

> "وجودی اعلان کرتا ہے کہ وہ معروضی دنیا کی بجائے صرف اپنے تجربے کو حقیقی جانتا ہے۔ اس کے نزدیک ذاتی ہی حقیقی ہے، وہ اپنی بے مثال انفرادیت پر اصرار کرتے ہوئے فطرت اور طبعی دنیا کی عمومی خصوصیات کے مقابلے میں اپنے وجود کو اساسی حیثیت دیتا ہے۔" (1)

یورپ میں وجودیت کی باقاعدہ ابتدا کرکیگارڈ سے ہوتی ہے کہ اس نے لفظ وجود کو نئے معانی دیے اور ان معانی کو قبول عام ہائیڈگر کی وجہ سے حاصل ہوا۔ اس نے وجود کی اہمیت کو واضح کیا اور حیاتِ انسانی اور فطرت کے جوہر (Essence) کو وجودِ انسانی کے مقابلے میں ثانوی قرار دیا۔ اس نے انہیں Existential یعنی وجودی کا نام دیا۔ بعد کے مفکرین نے اس لفظ کو برقرار رکھا۔ کرکیگارڈ نے یہ لفظ جرمن اصطلاح Existence Philosophy یا فلسفۂ زیست سے مستعار لیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر مرئی یا غیر مرئی چیز اپنا ایک وجود رکھتی ہے لیکن ہم وجود کا تصور صرف انسان سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے فرد ایک تنہا اکائی ہے۔ وہ اپنے عمل کے دائرے میں آزاد ہے اس لیے وہ آزادانہ انتخاب بھی کر سکتا ہے لیکن دراصل اس کے سارے دکھ کی بنیاد یہی آزادی ہے۔ چونکہ ہر آدمی زمان ومکان کے دائرے میں مقید ہے اس لیے اس کی آزادی محدود ہے۔ کوئی اہم فیصلہ کرنے کے لیے وقت بہت محدود ہوتا ہے اس لیے آزادئ انتخاب ہمارے ذہنی اضطراب کا سبب بن جاتی ہے کیونکہ ہم اس آزادئ انتخاب کے باوجود یہ نہیں جانتے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

وجودیت کے فلسفے میں بے کسی، مایوسی اور کرب کی اصطلاحات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ وجودی فلسفی جب "بے کسی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی خدا موجود نہیں بلکہ وہ ہم ہی ہیں جن پر تمام عواقب و نتائج کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مذہبی سطح پر انسان اپنے اچھے اور برے اعمال کا ذمہ دار خدا ہی کو گردانتا ہے خاص طور پر جب وہ شر کی طرف راغب ہوتا ہے تو یہ کہہ کر دل کو بہلاتا ہے اور یہ عذر بیان کرتا ہے کہ اس کے اعمال کا ذمہ دار خدا ہی ہے۔ اس طرح وہ اپنی ذمہ داری کو کسی دوسری ذات پر لاد دینا چاہتا ہے جب کہ وجودی فلسفی ارادے کی آزادی کے قائل ہیں۔ اس لیے تمام عواقب و نتائج کا ذمہ دار وہ انسان ہی کو ٹھہراتے ہیں۔ اپنے اعمال کے لیے کسی سہارے کا جواز ڈھونڈنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وہ ہم ہی ہیں جنہیں اپنے آپ کو جواب دینا ہے۔ وجودیت کا یہ دعویٰ ہے کہ آدمی اپنے جذبات کا خود ذمہ دار ہے۔ وہ محسوسات ہی کو اپنا معیار بناتے ہیں۔ ان کے نزدیک جذبے کی قدر کا تعین عمل ہی سے ہو سکتا ہے۔

مایوسی کی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ انسان زندگی بھر کسی نہ کسی صورت حال سے گزرتا رہتا ہے اگر وہ ایک صورت حال کا سدِباب کر بھی لے تو وہ ایک نئی Situation میں اسیر ہو جاتا ہے۔ انسان زندگی بھر صورتِ حالات کے اس سلسلے سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس کی آخری حد موت ہے۔ اس لیے مایوسی یا اضطراب انسانی وجود کا ایک ضروری جزو ہے۔ وجودی ادب میں کرب، بے کسی اور مایوسی جیسے الفاظ بار بار استعمال ہوتے ہیں۔ فرد اپنے اعمال کے عواقب کے لیے ذمہ دار ہے۔ ذمہ داری کا یہی احساس اسے کرب سے دوچار کرتا ہے۔ کرکیگارڈ کہتا ہے کہ یہ وہی کرب ہے جس سے حضرت ابراہیمؑ دوچار ہوئے تھے۔ زندگی اور موت کے سنگم پر کھڑے ہو کر یہ فیصلہ کرنا کہ وہ آگ میں کود جائیں یا نہیں، اپنے بیٹے کو قربان کر دیں یا اسے رد کر دیں، ایسی صورت حال ہے جس میں انتخاب کی ذمہ داری کلیتہً فرد کو قبول کرنی ہوتی ہے۔ یہ انتخاب یا تو ایک نئی زندگی بخشتا ہے یا موت کی طرف لے جاتا ہے۔

عینیت پسندی اور فطرت پسندی وجودیت کی ضد ہیں۔ عینیت میں خدا کے وجود کو وجودِ مطلق تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے وجود میں اپنے آپ کو جذب کر دینا انسانیت کی معراج سمجھا گیا ہے جب کہ نیچر لزم میں نیچر کے چند اصول اہمیت اختیار کر لیتے ہیں جن میں Heredity, Environment, Chance یعنی وراثت، ماحول اور موقعہ اہم ہیں۔ ان کے ہاتھوں انسان محض ایک بے بس بے جان سا کھلونا بن کر رہ جاتا ہے جو نہ تو آزاد ہے اور نہ اپنی مرضی کا مالک۔ اسے جو کچھ وراثت میں ملتا ہے اور وہ جس ماحول میں جیتا ہے وہی اس کا مقدر اور عمل بن جاتا ہے اور وہ ان کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وجودی فلسفے میں انسان اپنے عمل، فیصلے اور انتخاب کی قوت رکھتا ہے بلکہ اپنے جملہ اعمال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ عینیت پسند کے لیے وجودِ مطلق بہت بڑا سہارا ہے۔ وہ اپنے اچھے یا برے اعمال کا ذمہ دار قسمت یا خدا کو قرار دیتا ہے۔ اس تصور کی نفی کر کے وجودی اپنے انتخاب کا خود ہی ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کے لیے ماضی یا مستقبل کوئی چیز نہیں وہ لمحۂ موجود میں زندہ رہتا ہے۔ وہ کسی حسین ماضی کا اسیر نہیں ہوتا اور نہ ہی خوش آئند مستقبل کے سپنے دیکھتا ہے۔ وہ حال کے لمحے کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور اسی میں زندہ رہتا ہے۔ وہ اس لمحے پر اپنی گرفت رکھتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ وہ کسی سہارے پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ اپنے اعمال و افعال کے لیے کسی کو قصوروار یا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا بلکہ وہ اچھے یا برے نتائج کا خود ہی ذمہ دار ہوتا ہے اور وہ اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہے۔ وجودیت پر بہت سے اعتراضات کیے گئے جو درج ذیل ہیں:

الف۔ وجودیت انسان کو بے چارگی، خود غرضی اور بے بسی سکھاتی ہے۔

ب۔ وجودیت زندگی کے تاریک پہلو پر زور دیتی ہے اور فرد میں تنہائی کا احساس پیدا کر کے اس کو مایوسی اور مجبوری کا شکار بنا دیتی ہے۔

د۔ وجودیت کے مطابق انسان ہر ذلیل کام کر سکتا ہے اور گناہ اور جرم کی نوعیت کی کوئی شے باقی نہیں رہتی۔

و۔ وجودیت انسان کو ترقی سے روکتی ہے۔(2)

سارتر نے ان اعتراضات کا مکمل اور مدلل جواب دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تنہائی کا احساس انسان کی تکمیل کے لیے اس لیے ضروری ہے کہ بے بسی اور مایوسی اس کو عمل پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ تنہائی انسان کو اس کے انفرادی وجود کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے اور اسے اطمینان عطا کرتی ہے۔ انسان کو بے چارہ اور مجبور بنانے والا سب سے بڑا خوف موت ہے لیکن وجودیت نے اس خوف سے نجات کے لیے یہ راستہ بتایا ہے کہ موت کو اپنے وجود کا ایک لازمی حصہ تسلیم کر لیا جائے۔ وجودی فلسفیوں نے موت کے وجود

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

کو عناصرِ ترکیبی میں شامل کر کے موت کو بھی موضوعی حیثیت دے دی ہے۔ موت ہمارے وجود کا حصہ ہے اور ہمیں جلد از جلد اپنی تکمیل اور عظمت کا زینہ چڑھنا ہے اور یہ کام ہمیں خود کرنا ہے۔ ہماری موت کے بعد دوسروں سے یہ توقع بے معنی ہے کہ وہ ہماری خواہشات کا احترام کریں گے کیونکہ وہ تو اپنے وجود کے تقاضے پورے کریں گے۔ عمل پر زور دے کر دراصل انسان کو قنوطیت اور مایوسی سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے نہ کہ مایوسی کا سبق دینے کی۔

سارتر نے اس اعتراض کا جواب بھی دیا ہے کہ انسان میں گناہ اور جرم کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اس کا کہنا ہے کہ فرد جب اپنی آزادی سے اقدار کا انتخاب کرے گا تو چونکہ اپنے اعمال کا ذمہ دار وہ خود ہے اس لیے وہ یقیناً نیکی کا انتخاب کرے گا اور گناہ و جرم کا مرتکب نہ ہو گا۔ انسان اگر اپنی تقدیر کا مالک اپنے آپ کو سمجھے تو وہ یقیناً اپنے لیے بہتر فیصلہ ہی کرے گا۔ ایک خاص شے کو منتخب کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس کی قدر و قیمت کا تعین بھی کر رہے ہیں لہٰذا یہ نتیجہ بر آمد ہو گا کہ ہم کبھی شر کا انتخاب نہیں کریں گے۔

> "وجودیت انسان کو ترقی سے روکتی ہے" کے اعتراض کا جواب سارتر یوں دیتا ہے کہ وجود کے لیے کسی قسم کی ترقی یا تنزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وجود ہر لحہ مکمل بھی ہے اور تکمیل پذیر بھی۔ صرف حالات بدلتے ہیں وجود نہیں بدلتا۔ حالات کچھ بھی ہوں وجود کے تقاضے ہر لحہ وہی رہیں گے۔ وجود یا تو ہے یا نہیں ہے۔"(3)

وجودیت انسان کو بے چارگی اور مجبوری سے نکال کر اسے ایک وقار عطا کرتی ہے۔ وجودی اس بات پر فخر کرتا ہے کہ وجودیت نے فرد کو وقار دلوایا ہے۔ وجودیت کا فلسفہ بنیادی طور پر رجائی ہے۔ انسان کو اپنے عمل کی ساری ذمہ داری خود لینا ہوتی ہے یعنی اس کے نزدیک زندگی صرف اعمال کا نتیجہ ہے۔ ہر لحہ کی خوشی یا غمی، جہنم یا جنت کا تعین انسان کا عمل کرتا ہے۔ ایک وجودی کے نزدیک انسان تکمیل شدہ چیز نہیں ہے بلکہ تغیر پذیر ہے اس لیے آج کا بزدل کل کا ہیرو بن سکتا ہے۔ انسانی زندگی کی جہت ماضی متعین نہیں کرتا بلکہ خود اس کا عمل کرتا ہے جس کا تعلق اس کی تسلیم کردہ ذمہ داریوں سے ہے۔ اس فلسفے میں انسان اپنی تقدیر کا خالق خود ہی ہے۔ یوں بنیادی طور پر وجودیت کا فلسفہ عمل پر زور دیتا ہے۔ وجودی فلسفے کو پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیانی عرصے میں مقبولیت حاصل ہوئی خاص طور پر فرانس اور جرمنی میں اسے قبول عام حاصل ہوا۔ جنگ میں شکست کے بعد فکری اور نظریاتی اقدار کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا۔ آگ اور خون کے اس کھیل میں زندگی بے معنی اور انسانی جان ارزاں تھی۔ اس احساس کے تحت وجود اور زندگی کی اہمیت کا احساس کیا گیا۔ وجودیت کی بنیاد رکھنے والوں میں جرمنی اور فرانس کے ادیب شامل ہیں۔ ڈیکارٹ رینے کا تعلق فرانس سے تھا۔ اس نے اپنے نظریات کی بنیاد اس نکتے پر رکھی کہ "میں سوچتا ہوں، اس لیے ہوں"

(I think, Therefor I am) ہیگل ڈیکارٹ کو جدید فلسفے کا مورثِ اعلیٰ کہتا ہے۔(4)

پاسکل (1623-1662) کو وجودیت کا پیش رو سمجھا جاتا ہے اس نے کہا "میں ہوں، اس لیے سوچتا ہوں (5)"

ہیگل (1770-1831ء) جرمن فلسفی تھا۔ اس کے فلسفۂ جدلیت نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ اس کے فلسفۂ مظہریت سے جدید وجودیوں نے اکتساب کیا ہے۔ کیرکیگارڈ کو جدید وجودیت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ "وہ قدر و اختیار اور شخصی انتخاب کو بڑا اہم سمجھتا ہے۔ وہ اپنے انتخاب اور فیصلے کو شخصی چناؤ سمجھتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ کوئی ذات مطلق اس کے لیے کسی قسم کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ وہ خود اپنی مرضی اور اپنے اختیار کا مالک ہے (6)" جرمن فلاسفر اور نقاد نطشے نے فوق البشر (Supper Man) کا تصور دیا۔ باقی نہ رہنے کے خوف سے چھٹکارے کے لیے غلامانہ طرزِ زندگی کو ارادے کی عصا اس تصور کے ذریعے دی گئی تاکہ تقدیر کے مجہول تصور سے چھٹکارا پایا جا سکے۔

جرمن فلاسفر کارل جیسپرز (1883-1969ء) فرد کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔

> " اس کا کہنا ہے ہر فرد ایک خاص لمحے میں موجود ہے اور وہ خاص قسم کے تجربات و واردات سے دوچار ہے۔ اس صورتحال میں اسے کسی وجود مطلق کا خیال نہیں آتا بلکہ صرف موجود واردات ہی اس کے پیش نظر رہتی

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ہے۔ وہ صورت حال کو Boundary Situations کا نام دیتا ہے جو خوف، مصیبت اور موت کا اختیاری روپ ہیں۔ (7) "

مارٹن ہائیڈگر (1889-1976ء) جرمن فلاسفر تھا۔ اس نے یہ سوال اٹھایا کہ ہستی کیا ہے اور کیا، کیا ہے؟ What is Bieng,What is What وہ اس سوال کا آسان سا جواب دیتا ہے کہ جب تک خارجی سطح پر ہمیں ہماری موجودگی کا ادراک نہیں ہوتا ہمیں باطنی سطح پر مخصوص موجودگیوں کے بارے میں سوچتے رہنا چاہیے تاکہ ہم موجود کے واسطے سے وجود کی اتھاہ تک پہنچ جائیں (8)

ژاں پال سارتر (1905-1980ء) فرانسیسی وجودیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ 1938ء میں اس کا ناول ناسیا La.Nausee شائع ہوا۔ 1943ء میں اس کی فلسفیانہ کتاب Being and Nothingness شائع ہوئی اور اسے وجودی فلسفے کا منشور قرار دیا گیا۔ سارتر کہتا ہے کہ "آدمی اس کے علاوہ کچھ نہیں جو کچھ اپنے آپ کو بناتا ہے۔ یہ وجودیت کا بنیادی اصول ہے۔ "(9) خدا اور اس کے وجود و عدم سے بحث کرتے ہوئے سارتر کہتا ہے:

> "دوہری وجودیت جس کا میں نمائندہ ہوں۔ اس امر کا سختی سے اعلان کرتی ہے کہ اگر خدا موجود نہیں تو بھی کم از کم ایسی ہستی ضرور موجود ہے جس کا وجود اس کے جوہر پر مقدم ہے۔ 'وجود جوہر پر مقدم ہے' سے مراد یہ ہے کہ انسان پہلے وجود میں آتا ہے۔ اپنی ذات کا سامنا کرتا ہے۔ کائنات میں ابھرتا ہے اور پھر کہیں اپنے تصور کی تشکیل کرتا ہے۔ انسان ابتدا میں کچھ نہیں ہوتا۔ وہ وہی کچھ ہے جو کچھ کہ اپنے آپ کو بناتا ہے۔ "(10)

سارتر کے نزدیک انسانی وجود کی کلید اس کا آزادانہ انتخاب ہے۔ وہ فرائیڈ کے لاشعور کو رد کرتا ہے کیوں کہ اس سے جبریت کا احساس ہوتا ہے۔ سارتر کے فلسفیانہ خیالات نے بیسویں صدی کے ادیبوں اور شاعروں کو کافی متاثر کیا ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ زندگی بے معنی ہے، کائنات لایعنی ہے، خدا موہوم ہے، کوئی اخلاقی قانون موجود نہیں، انسان مختارِ مطلق ہے، دنیا غلاظت کا ڈھیر ہے، عشق و محبت محض واہمہ ہے۔ فطرت اور عورت کے حسن و جمال کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے باوجود انسان کو چاہیے کہ وہ آزادی اور کامل ذمہ داری سے زندگی بسر کرے۔ ایک کارِ محال ہے۔ (11) "

البرٹ کامیو (1913-1960ء) نے سارتر کے فلسفہ لغویت کو وسعت دینے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی کا واحد سنجیدہ مسئلہ خودکشی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان دائمی طور پر بے معنویت کی صورتحال سے نبرد آزما ہے مگر صورتحال پر غالب آنے والی سرگرمیاں لاحاصل ہیں۔ اس کے خیال میں انسان کو Sisyphus کی مانند بے مقصد اور بے سود تگ و دو کا المیہ قبول کر لینا چاہیے کہ ہر صبح پتھر گھسیٹ کر چٹان تک لے جانا اور ہر شام اسے ڈھلان پر لڑھکا دینا زندگی کی بے معنویت کا دائرہ بھی ہے اور انسانی مزاحمت و موجودگی کا اثبات بھی۔ (12) وجودیت کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہ بنا کہ اس نے انسان کو اس کا انتخاب و عمل کا حق دلایا۔ یہ تصور انسان کو اعتماد بخشتا ہے کہ اُسے اختیار کی آزادی حاصل ہے، داخلی کیفیات کو اہمیت حاصل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وجود کو بطور وجود اہمیت دیتا ہے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اردو ادب کا بنیادی ڈھانچہ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی نظریات و تصورات کے امتزاج سے بنا ہے۔ اسلامی فلسفے میں عربی زبان ہے۔ ہماری تہذیب اور کلاسیکی شاعری کی زبان و موضوعات پر فارسی ادب کے گہرے اثرات ہیں۔ ہماری داستانوں اور اساطیری کہانیوں پر ہندی دیومالائیت کی گہری چھاپ ہے۔ جرمن، فرانس اور انگلینڈ کی تحریکوں اور نظریات و اصناف سے اردو ادب میں افسانہ و ناول کی اصناف اور رومانویت، ترقی پسندی، جدیدیت و مابعد جدیدیت اور اب وجودیت جیسے نظریات نے فروغ پایا ہے۔ وجودیت کا فلسفہ بنیادی طور پر فرانس اور جرمنی کا فلسفہ ہے جو پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کی غارت گری اور انسانی قتلِ عام کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آئی۔ اس میں انسانی خون کی ارزانی کو دیکھ کر انسانی وجود کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور موت کو وجود کا لازمی جزو قرار دیا گیا۔

اُردو ادب میں وجودیت کا تعلق تصوف سے جوڑنے کی کوشش کی گئی تاہم سارتر کے خدائی انکار کو ہمارے یہاں تسلیم نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود علمی و ادبی بحث اور نقطۂ نظر کے حوالے سے ہمارے ادیبوں نے وجودیت کے فلسفے میں دلچسپی لی اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

"اس فلسفہ نے بیسویں صدی کے ذہن انسانی کو اس کی ناامیدی، بے یقینی اور عدم اعتماد سے نجات دلا کر اپنی ذات پر اعتماد کرنا سکھایا۔ اس نے خیر و شر کی ساری ذمہ داری فرد کے کاندھوں پر ڈال دی اور بتایا کہ آدمی اس کے سوا کچھ نہیں جو وہ خود کو بناتا ہے۔(13)"

ریاض احمد کے مطابق وجودیت کا نقطۂ خاص اس کی داخلیت ہے۔(14) جہاں کچھ ادیبوں نے وجودی نظریے کے مثبت پہلوئوں پر نظر ڈالی ہے وہیں کچھ ادباء نے اس کے منفی اثرات کو بھی گرفت میں لیا ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا کہنا ہے "وجودیت کوئی فلسفہ نہیں۔ یہ مایوسی کا رویہ ہے (15)" اسی طرح احمد ندیم قاسمی، سی۔ اے قادر اور علی عباس جلالپوری نے سارتر کے تصورِ آزادی پر بحث کی ہے اور اس کے تضاد و انتشارِ فکر کو واضح کیا ہے۔ اردو کے ادیبوں میں کوئی بھی اس تحریک کی براہِ راست معاونت کرتا دکھائی نہیں دیتا لیکن ہمارے بعض ادباء و شعراء کی تخلیقات میں وجودی عناصر غیر شعوری اور شعوری طور پر ضرور جھلکتے ہیں۔ وحید اختر لکھتے ہیں:

"اردو کے ادیبوں میں وجودی اور غیر وجودی کا امتیاز کرنے کا سوال ہی نہیں کیوں کہ کوئی بھی شاعر، ناولسٹ یا افسانہ نگار اس مکتب فکر کا ہیرو ہے نہ مفسر لیکن جدید عہد کے بہت سے شاعروں، افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں کے یہاں ہمیں وجودیت کے عناصر منتشر حالت میں مل جائیں گے۔ (16)

قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کے آغاز میں ایلیٹ کی نظم کے جو مصرعے درج کیے گئے ہیں ان میں وقت اور موت کے سامنے انسان کی بے بسی کا نوحہ ملتا ہے۔ سارتر لادینی وجودیت کا بانی ہے۔ وہ انسان کو اس کے فعل کی وجہ سے اہم جانتا ہے اور خدا کے تصور سے ہی انکار کرتا ہے۔ آگ کا دریا میں مہاویر کہتا ہے

"خداوندِ عالم کا کوئی وجود نہیں۔ دنیا ابدی ہے اور اپنے وجود پر قائم اور مادہ اور خلا اور دھرم اور روحوں کی ترکیب سے بنی ہے صرف یہی ایک حقیقت ہے۔(17)"

اور شاکیہ منی کہتی ہے :

"خدا ہو یا نہ ہو۔ حقیقت محض یہ ہے کہ دکھ موجود ہیں۔ باسٹھ فلسفے اودیا کے باسٹھ گُن ہیں۔ محبت بے کار ہے، فلسفہ بے کار ہے۔ سب مہالوہ ہے۔ سب مایا ہے، سب دھوکا ہے۔ شروع میں نہ وجود تھا اور نہ عدم وجود۔ ہر شے خلائے غیر حقیقی ہے۔ (18)

"آگ کا دریا" میں کئی جگہ کردار وقت کے آگے بے بس ہو کر فنا کا قائل ہو جاتے ہیں اور خدا کی ذات سے منکر بھی۔ ناول میں کرداروں کے ذریعے موت کے خوف کو واضح کیا گیا ہے:

"موت سے سہم کر شاعر نے زمین سے استدعا کی ۔۔۔ اور ایسا ہو کہ اس کی آنکھیں سورج کے پاس جائیں ۔۔۔ اس کی سانس ہوا میں تحلیل ہو یا آسمان پر جائے یا زمین پر رہے جیسا اس کا مقدر ہے اور اس کے ہاتھ پائوں پردوں کی شکل میں پھر سے نمودار ہوں۔(19)"

"بیچاری لڑکیو! تم جو پھولوں کے کنج میں ناچ رہی ہو۔۔ یاد رکھو کہ جب تم چاندنی کی اس دنیا سے باہر چلی جائو گی تو پھر کبھی لوٹ کر نہ آئو گی۔ دوسرے تمہاری جگہ لے لیں گے۔ ان سب جگہوں پر وہی سب ہو گا جو تمہارے وقت میں ہوتا تھا لیکن دنیا بدل چکی ہو گی۔ دنیا لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہے۔(20)

موت کے اس تصور سے لڑنے کے لیے کردار وقت اور تاریخ کے تسلسل اور بہائو کو اپنے بس میں کر کے زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ محبت کا جو تصور "آگ کا دریا" میں ملتا ہے وہ بھی وجودی فکر کا حامی ہے کیوں کہ وجودی محبت اور موت دونوں کو زندگی کے لیے بے معنی قرار دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں ہر وجود اپنی تنہائی سے

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

فراریت کے لیے کسی کو پسند کرلیتا ہے اور اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ وجودی مفکرین جمالیاتی مادیت پرستوں کی طرح لذتیت کے حامی نہیں بلکہ اس کے منکر ہیں۔ قرۃ العین حیدر بذاتِ خود جنس کے بیان سے کتراتی ہیں اور وہ رومانی جذبوں کو تضحیک کا نشانہ بھی بناتی ہیں۔ یوں شعوری و غیر شعوری طور پر وہ وجودی نظریے کی حمایت کرتی ہیں۔(21)

نثار عزیز بٹ کے ناول "کاروانِ وجود" میں بھی وجودی عناصر کا اثر نمایاں ہے۔ اس ناول میں دو کرداروں ثمر اور سارہ کے ذریعے عینیت پسندی اور وجودیت کے فلسفوں کو واضح کیا گیا ہے۔ ثمر کا کردار وجودی عناصر اور سارہ کا کردار عینت پسندی کے نظریے کو اجاگر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ثمر کا کردار اپنے اندر سحر انگیزی اور پراسراریت سموئے ہوئے ہے۔ ناول کے ابتداء سے اختتام تک اس کی دلکشی، سحر اور آزادیٔ افکار کو عمل کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔ ثمر کے کردار میں انتخاب و عمل کی آزادی کا عنصر وجودیت کا مظہر ہے۔ وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارتی ہے۔ وہ تمام اقدار سے ماوراہو کر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ وہ میثل سے محبت کے باوجود اس کا معروض بننا پسند نہیں کرتی۔ اسی طرح جب وہ حسن رضا سے شادی کرتی ہے تو بھی آزادی کا حق اپنے پاس رکھتی ہے کہ وہ جب چاہے اس کو چھوڑ سکتی ہے۔ گویا وہ کسی قیمت پر بھی اپنی آزادی کو کھونا نہیں چاہتی۔ یہ عنصر اس پر غالب رہتا ہے اور آخر کار وہ اپنی مرضی سے حسن رضا کو چھوڑ کر دیارِ غیر چلی جاتی ہے۔ سارہ جب ثمر کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے اور اسے شادی کرنے پر راغب کرنے کے لیے دلائل دیتی ہے تو ثمر جو جواب دیتی ہے وہ وجودی فکر کی اساس ہے۔

> "چت بھی قیمت، پٹ بھی قیمت اور یک مشت نہیں ایک ساتھ نہیں لحظہ لحظہ ہر آن، قسط در قسط، قیمت، قیمت، قیمت۔ بچپن کا حساب دو، جوانی زناٹے سے گزرتی دیکھو، بڑھاپے کا سامان کرو، پھر بڑھاپے کا کشٹ اٹھاؤ۔ اس کٹھن راہ کے اختتام پر جانکنی کا عذاب اور ابدی دوزخ کا ہوا۔ اتنی بڑی قیمت چند سانسوں، چند رنگوں، چند ذائقوں کے لیے؟؟(22)

وجودی فکر رکھنے والے اردو کے اہم ناول نگار ڈاکٹر انیس ناگی ہیں۔ انہوں نے کامیو کے ناولوں کے تراجم بھی کیے۔ وہ براہِ راست فرانسیسی ادب سے واقفیت رکھنے کی بنا پر وجودی فلسفے کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ کامیو سے ان کی ذاتی دلچسپی نے ان کے فن پر کامیو کے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان کا ناول "دیوار کے پیچھے" اپنے عصر کے کرب کا بیان ہے۔ "میں اور وہ" میں انقلابی حکومتوں پر شدید طنز کیا گیا ہے کیوں کہ وہ زندگی کی اعلیٰ ترویج کی بجائے نعرہ بازی کے قائل ہیں جبکہ وجودیت عمل کی طرف راغب کرتی ہے۔ انسانی وجود، معاشرہ اور اقدار و روایات سب مل جل کر ایک اکائی بناتے ہیں۔ اس میں کسی ایک عنصر کو اہم قرار دے دیا جائے تو ایک فلسفہ، نظریہ اور تحریک جنم لیتی ہے۔ اقدار و روایات کی پابندی کلاسیک، ان سے بغاوت رومانویت، مادی اقدار کی پرکھ ترقی پسندی، اور انسانی وجود پر فوکس کرنا وجودیت کہلاتا ہے۔ ان سب نظریات و فلسفوں میں فرد کی ذات اہم ہے اور یہ فرد جب تک اس کائنات میں موجود ہے اسے مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا جاتا رہا ہے اور پرکھا جاتا رہے گا اور یوں ہی نئے نئے نظریے، فلسفے اور تحریکیں ورجحانات جنم لیتے رہیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۲۔ عرش صدیقی، وجودیت کیا ہے، مشمولہ ادبی دنیا، شمارہ پنجم دوازدہم، بہار ۱۹۶۴ء، ص:۲۴۶

۳۔ ایضاً، ص:۲۴۸

۴۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، ص:۱۹

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً، ص:۲۲

۷۔ ایضاً، ص:۲۵، ۲۶

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

۸۔ایضاً، ص:۲۶،۲۷

۹۔ایضاً، ص:۳۱

۱۰۔ایضاً، ص:۳۳

۱۱۔ایضاً، ص:۳۴

۱۲۔ایضاً، ص:۳۷

۱۳۔ جمیل جالبی، تنقید اور تجربہ، ۱۹۶۷ء، ص:۳۶۸،۳۶۷

۱۴۔ریاض احمد، وجودیت کیا ہے مشمولہ ادبی دنیا، ص:۲۳۲

۱۵۔بحوالہ جدید اردو نظم میں وجودیت، ص:۴۸

۱۶۔وحید اختر، آگ کا دریا اور وجودیت مشمولہ قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ مرتبہ ارتضیٰ کریم، ۱۹۹۲ء، ص:۲۶۷

۱۷۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، لاہور: قوسین، ۱۹۸۵ء، ص:۷۲

۱۸۔ایضاً

۱۹۔ایضاً، ص:۶۶

۲۰۔ایضاً، ص:۳۵۵

۲۱۔ حمیرا اشفاق، فرانسیسی اردو تراجم کے اُردو ناولوں پر اثرات، مقالہ برائے ایم۔ فِل اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۰۶ء، ص:۱۷۰

۲۲۔ نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود، راولپنڈی، ایس ٹی پرنٹرز، ۱۹۸۰ء، ص:۱۷۴